بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

○

نظرات

"فکر و نظر" کے مارچ کے شمارے میں اس موضوع پر کہ پاکستان میں اسلامی قوانین کو نافذ کرنے کا کون سا طریقہ کار مناسب اور مفید رہے گا۔ اور اسلامی قوانین کے نفاذ کی جو اصل غرض امت اسلامیہ کے حقیقی بہی خواہوں کے پیش نظر ہے، وہ کس طرح پوری ہو سکتی ہے، کچھ معروضات کی گئی تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر قوم و ملک اور حکومت و مملکت کی تمام تر صلاحیتوں اور قابلیتوں کا انحصار انسانی معاشرے پر ہوتا ہے، جس پر کہ ان کی عمارت اٹھائی جاتی ہے۔ ایک معاشرہ جس قدر صالح اور باصلاحیت ہوگا، اسی قدر اس معاشرے کی بنیادوں پر قائم ملک و قوم اور حکومت و مملکت میں صالحیت اور صلاحیت پائی جائے گی۔ آج پاکستان میں ہمیں جو مسئلہ درپیش ہے، وہ یہ ہے کہ اس تبدل پذیر (TRANSITIONAL) دور میں جب کہ ہمارے ہاں بڑی سرعت سے اور کافی وسیع پیمانے پر صنعتیں لگ رہی ہیں، جن کے نتیجے میں زندگی کی پرانی قدروں پر زد پڑ رہی ہے، کس طرح اپنے معاشرے کو تمدنی توڑ پھوڑ اور اخلاقی انتشار سے جو تاریخ میں ایسے دور کا حتمی نتیجہ ہوتا ہے، بچا کر اسے زمانے کے ساتھ کامیابی سے چلنے کے قابل بنائیں۔

پاکستان میں صنعتی انقلاب کی شروعات ہو چکی ہیں۔ اور جیسے جیسے وقت گزرے گا، اس انقلاب کا پھیلاؤ اور گہرائی بڑھے گی اور لامحالہ اس کے ہمارے معاشرے پر اثرات بھی پڑیں گے۔ اچھے بھی اور بُرے بھی۔ بُرے اثرات کو کس طرح روکا جائے اور اچھے اثرات کے لئے فضا کیسے ہموار کی جا سکتی ہے، ان امور پر سوچنا اور ان کے بارے میں اپنی اپنی استطاعت کے مطابق رائے عامہ کی رہنمائی کرنا تمام اربابِ فکر اور اہل علم کا فرض ہے۔

ہر معاشرے کی ایک اخلاقی اساس ہوتی ہے۔ اور وہ اساس عبارت ہوتی ہے، ان قدروں سے جن کا

قیام وحصول اس معاشرے کے افراد کا منتہائے نظر اور ان قدروں کی ضد کا سدّباب ان کا مقصد اوّلین ہوتا ہے۔
اس میں شک نہیں کہ ہمارے علمائے کرام اسلامی قوانین کے نفاذ کا جو مطالبہ کر رہے ہیں، تو اس سے ان کی اصل غرض دراصل یہی ہے کہ پاکستان کے معاشرے کو اسلام نے جو ہمیں اخلاقی قدریں دی ہیں، ان پر استوار کیا جائے۔
ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ان اخلاقی قدروں کو مؤثر و فعال بنانے کے لئے انہیں لازماً ایک نظام حیات کی شکل دینا ہوگی۔ اور یہ اسلامی قوانین کو معاشرے پر نافذ کئے بغیر ممکن نہیں۔

غرض اسلامی قوانین کے نفاذ سے ایک تو ہمارے معاشرے کو وہ اخلاقی اساس مل جائے گی جو ایک معاشرے کے مثبت و صالح وجود کے لئے ضروری ہے۔ دوسرے اس سے ہمارے معاشرے کا داخلی ربط و ضبط قائم رہ سکے گا اور وہ موجودہ تبدیل پذیر دور کے خلفشار پیدا کرنے والے حملوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوگا۔ کسی معاشرے کا اپنے ماضی سے رشتہ توڑ لینا اتنا ہی خطرناک ہوتا ہے، جتنا اس کا حال و مستقبل کی ضرورتوں سے آنکھیں بند کر لینا۔
ہم اپنے ہاں اسلامی قوانین کو نافذ کر کے پاکستان کے اسلامی معاشرے کو اس کے ماضی، ماضی کی صالح روایات اور ان کی زندگی بخش اور اخلاق پرور رشتوں سے مربوط رکھ سکتے ہیں۔ اور اس طرح اُس میں خود اپنے آپ پر، اپنے ماضی پر اور اپنی تاریخی و اخلاقی برتری پر بھی ایمان رہے گا۔ اس کو داخلی و جذباتی ہم آہنگی بھی نصیب ہوگی۔ اور اسے اخلاقی اعتبار سے بھی ایک قوت ملے گی۔ زندہ رہنے کی قوت۔ آگے بڑھنے کی قوت۔ دوسروں کا مقابلہ کرنے اور ان پر غالب آنے کی قوت۔

ملک میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا یہ مقصد ہے اور یہی مقصد ہونا چاہیئے۔ اور اس کے حصول کے لئے ضروری ہے، جیسا کہ "فکر و نظر" کے مارچ کے شمارے میں عرض کیا گیا کہ ہم اسلامی قوانین کو، جیسا کہ دوسرے مسلمان ملک کر رہے ہیں، غیر فرقہ وارانہ بنیادوں پر مدون کر کے انہیں اپنے ہاں نافذ کریں کیونکہ اصل مقصود معاشرے میں اسلام کی صحیح روح کو جاری و ساری کرنا اور اسے اسلامی سانچے میں ڈھالنا ہے۔ اور یہ معاملہ کسی مخصوص ظاہری شکل کا اتنا نہیں، جتنا اسلام کی مجموعی روح اور قالب کا ہے۔

مثال کے طور پر مصر کے مشہور عالم دین اور مصنف شیخ ابوزہرہ اس باب میں۔ کہ باوجود اس کے کہ دولتِ عثمانیہ اور مصر کا سرکاری فقہی مذہب حنفی تھا۔ انھوں نے بعض امور میں اس پر دوسرے مذاہب فقہ کے قوانین کو ترجیح دی، اور انہیں نافذ کیا۔ لکھتے ہیں:۔ حنفی مذہب کے نفاذ میں دو مشکلات حائل ہوتی ہیں۔ ایک "شکلی"۔ دوسری "موضوعی"۔ "شکلی" یہ کہ حنفی قاضی اپنے فیصلوں میں غیر مکتوب قانون پر اعتماد کرتے تھے۔ اس لیے حنفی

قانون کا مواد مدون نہیں۔ اور اس کے فروع بھی جمع نہیں کئے گئے۔ چنانچہ قاضیوں کو اپنے مذہب کے متعدد اقوال میں سے ایک قول کو خود ترجیح دینی پڑتی ہے۔

حنفی مذہب کے نفاذ میں "موضوعی" مشکل شیخ موصوف کے الفاظ میں یہ ہے کہ بعض مسائل میں وہ روح عصر کے ساتھ اتفاق نہیں کرتا۔ اور دوسرے مذاہب ان مسائل میں اتفاق کرتے ہیں (ان العمل بذلك المذهب الجليل فی مسائل ليس فی الاخذ بها ما يتفق مع روح العصر و فی غيره من المذاهب ما يوافق العصر و يلائمه)۔
شیخ ابو زہرہ لکھتے ہیں کہ اسی بنا پر پہلے دولتِ عثمانیہ میں اور پھر مصر میں یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ زواج، طلاق اور بعض دوسرے امور میں صرف فقہ حنفی پر انحصار کرنا ٹھیک نہیں رہے گا۔

اور یہ رائے صرف شیخ ابو زہرہ کی نہیں۔ بلکہ اس سے پہلے دولت عثمانیہ کے لئے "مجلّہ" مرتب کرنے والوں کی بھی یہی رائے تھی۔ چنانچہ "۱۹۱۷ء میں دولتِ عثمانیہ نے قانونی ازدواج اور فرقت بین الزوجین کا قانون جاری کیا، جس میں مذہب حنفی کے بعض احکام سے اعراض کرتے ہوئے دوسرے مذاہب اسلامیہ کے احکام کو پیش نظر رکھا گیا تھا۔ مثلاً تفریق بین الزوجین۔ عدم وقوع طلاق مکرہ و سکران و فساد عقد زواج مکرہ۔"

مراکش کا سرکاری فقہی مذہب مالکی ہے۔ لیکن جنوری ۱۹۵۸ء سے وہاں جو شخصی قوانین نافذ کئے گئے ہیں، ان میں دوسرے مذاہب فقہ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ ایک قانون کے ذریعہ مرد اور عورت کے لئے نکاح کی عمر مقرر کر دی گئی ہے۔ نکاح کے لئے ولی کی رضامندی کی شرط کا قانون مالکی مذہب کے بجائے تقریباً حنفی مذہب سے لیا گیا ہے۔ ایک قانون میں اس امر کی صراحت ہے کہ جہاں ایک سے زیادہ بیویوں میں عدم عدل کا خوف ہو، وہاں تعدد ازدواج جائز نہیں۔ نیز نکاح کے وقت ایک بیوی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ خاوند سے دوسری عورت سے نکاح نہ کرنے کی شرط کر لے۔ اور اگر خاوند اس کی خلاف ورزی کرے تو بیوی فسخ نکاح کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ شیخ ابو زہرہ ان امور پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جہاں تک اس آخری دفعہ کا تعلق ہے، فقہ حنبلی میں اس کا جواز موجود ہے، اور اس کی اصل سنت میں ہے۔ لیکن اسی دفعہ میں یہ بھی مذکور ہے کہ اگر بیوی نے نکاح کے وقت ایسی شرط نہ کی ہو اور خاوند دوسری عورت سے نکاح کر لیتا ہے تو اس صورت میں بھی بیوی قاضی کے ہاں مرافعہ کر سکتی ہے کہ وہ اس امر کا جائزہ لے کہ خاوند کے اس فعل سے اسے کتنا ضرر پہنچا۔ نیز یہ کہ دوسرا نکاح کرنے والے کو لازمی طور پر دوسری عورت کو بتانا ہوگا کہ اس کی پہلی بیوی موجود ہے۔

شیخ ابوزہرہ کے نزدیک عدم عدل کے اندیشہ کی بنا پر تعدد ازواج کا جائز نہ ہونا اور دوسری بیوی کر۔ پر پہلی بیوی کو قاضی کے ہاں مرافعہ کرنے کی اجازت دینا۔ ان دو قوانین کی فقہ اسلامی میں کوئی اصل نہیں (ولا نعلم لہما اصلاً فی الفقہ الاسلامی) مراکشی قوانین ہی کے سلسلے میں شیخ موصوف لکھتے ہیں:۔ "ان میں طلاق کے بارے میں دو ایسے امور ہیں، جن کی فقہ اسلامی میں اصل موجود ہے۔ اوّل حیض کی حالت میں طلاق واقع نہیں ہوتی۔ اس کی اصل فقہ اسلامی میں ہے۔ اور یہ شیعہ امامیہ اور ابن تیمیہ کا مذہب ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ مراکشی قانون نے ان دونوں مذاہب سے یہ بات تو لے لی لیکن اس میں ایسی تبدیلی کر دی کہ سنت سے اس کا اتفاق ہو گیا یعنی مراکشی قانون میں یہ ہے کہ حیض میں طلاق تو ہو جاتی ہے لیکن خاوند کو اس سے مراجعت کرنا لازمی ہے (نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عبداللہ بن عمر کو جنہوں نے اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دے دی تھی، مراجعت کا حکم دیا تھا) دوسرے مراکشی قانون نے دو عادل گواہوں کے سامنے طلاق دینا واجب قرار دیا ہے (یجب تسجیل الطلاق لدی شاھدین عدلین منتصبین للاشہاد) اس پر شیخ ابوزہرہ یوں رائے زنی کرتے ہیں کہ اگرچہ نص میں یہ صراحت نہیں ملتی کہ طلاق کے واقع ہونے کے لئے شہادت شرط ہے لیکن مذاہب فقہ میں اس کی اصل موجود ہے، جس کا مفہوم قرآن مجید کی بعض نصوص سے ملتا ہے، چنانچہ شیعہ امامیہ کے نزدیک دو عادل گواہوں کی موجودگی کے بغیر طلاق واقع نہیں ہوتی۔ اور یہ انھوں نے قرآن مجید کی اس آیت سے مستنبط کیا ہے، جہاں طلاق اور رجوع کے ذکر کے بعد ارشاد ہوا ہے:۔ "وأشهدوا ذوی عدل منکم واقیموا الشهادة۔"

شیخ ابوزہرہ تونسی قانون کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ اگرچہ اس کی اساس مذہب مالکی ہے، لیکن اس میں دوسرے مذاہب فقہ کے احکام بھی شامل کر لئے گئے ہیں۔ مثلاً تونسی قانون میں نکاح کے وقت صرف بیوی کو خاوند سے شرط کرنے کا حق حاصل نہیں، بلکہ مذہب حنبلی کے مطابق خاوند اور بیوی دونوں ایک دوسرے سے ایسی شرطیں کر سکتے ہیں، جو شرعاً ممنوع نہ ہوں، حالانکہ مالکی مذہب میں نکاح کے وقت جو شرطیں کی جائیں، ان کا پورا کرنا واجب نہیں اور امام مالک نے تو نکاح کے وقت شرطیں کرنے سے منع کیا ہے۔

شیخ موصوف کے نزدیک تونسی قانون میں بعض ایسی نئی باتیں بھی ہیں، جو ان کی رائے میں اسلام کے اصول و مبادی میں سے نہیں ہیں، مثلاً اس قانون کی دفعہ ۱۸ یہ ہے:۔ "تعدد ازواج ممنوع ہے۔ ایک بیوی کے ہوتے دوسری شادی کرنے کی سزا ایک سال قید اور بیس ہزار فرانک جرمانہ ہے۔ ان دو میں سے ایک سزا بھی دی جا سکتی ہے۔"

طلاق کے بارے میں تین دفعات ہیں :- دفعہ ۳۰۔طلاق عدالت ہی میں دی جاسکتی ہے۔ دفعہ ۳۱۔طلاق ان تین صورتوں میں واقع ہوگی۔ (۱) بیوی یا خاوند میں سے کسی ایک کے مطالبے پر ان اسباب کی بنا پر جو اس مجلہ میں مذکور ہیں۔ (۲) بیوی اور خاوند دونوں کی مرضی سے (۳) اگر خاوند طلاق کا مطالبہ کرتا ہے تو حاکم بیوی کو طلاق سے جو ضرر پہنچے گا، اس کا اسے خاوند سے مالی معاوضہ دلوائے گا۔ اسی طرح اگر بیوی طلاق کا مطالبہ کرتی ہے تو اسے خاوند کو ہرجانہ دینا ہوگا۔ دفعہ ۳۲۔طلاق کا حکم سنانے سے پہلے حاکم کا فرض ہوگا کہ وہ خاوند اور بیوی میں اصلاح حال کی پوری کوشش کرے۔

شیخ ابوزہرہ تونسی قانون کی ان دفعات پر تنقید کرتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں :-"اس قانون نے طلاق دینے اور معاوضہ ادا کرنے کے معاملے میں مرد اور عورت کو ایک درجہ دے دیا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ امت کے اسلاف میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ واقعہ یہ ہے کہ طلاق دینے کا حق صرف مرد کو ہے۔"

اردن میں نکاح کی لڑکے کے لئے ۱۶ سال اور لڑکی کے لئے ۱۵ سال کی عمر مقرر ہے۔ اور ایک دفعہ میں یہ صراحت ہے:-
"قاضی یا اس کا نائب کسی ایسے نکاح کی اجازت نہ دے، جہاں مرد اور عورت میں بیس سال سے زیادہ کا تفاوت ہو۔ وہ اس صورت میں اس کی اجازت دے سکتے ہیں اگر کم عمر فریق اس کی رضامندی دے کہ وہ کسی جبر کے بغیر اس کے لئے تیار ہے۔ اور اس میں اُس کی مصلحت ہے۔"

اردنی قانون میں نان ونفقہ اور نسب کے سلسلے میں عدت کے لئے حنفی فقہ کو اختیار کیا گیا ہے اور عزیز و اقارب پر مصارف کرنے کا قانون مذہب احمد بن حنبل سے لیا گیا ہے۔

انہی سالوں میں عراق میں ایک دفعہ شیخ ابوزہرہ کے بیان کے مطابق تعدد ازواج کو مطلقاً ممنوع قرار دے دیا گیا اور وراثت میں لڑکے اور لڑکی کا حصہ بھی یکساں کر دیا گیا، لیکن جیسے ہی حکومت تبدیل ہوئی، یہ احکام منسوخ کر دیئے گئے۔

شام میں تعدد ازواج پر یہ پابندی تھی کہ اگر قاضی پر یہ ثابت ہو جائے کہ دوسری بیوی کرنے والا اس کے مصارف کا بار نہیں اٹھا سکے گا، تو وہ اسے نکاح کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ جب مصر و شام متحد ہوئے، تو اس قانون کو منسوخ کر دیا گیا۔ اسی طرح مرد اور عورت کی عمروں میں اگر بہت تفاوت ہو تو شامی قانون میں قاضی کو اختیار ہے کہ وہ ایسے نکاح کی اجازت نہ دے۔ اسی قانون کی دفعہ ۱۱۷ یہ ہے :- اگر مرد اپنی بیوی کو طلاق دے دے اور قاضی پر ثابت ہو جائے کہ مرد نے طلاق دینے میں بغیر کسی معقول سبب کے زیادتی کی ہے۔ اور یہ کہ اس سے بیوی کو فقر و فاقہ کا سامنا کرنا پڑے گا تو قاضی بیوی کو خاوند سے عدت کے نفقہ کے علاوہ زیادہ سے زیادہ ایک سال کا نفقہ

دلواسکتا ہے۔ یہ نفقہ ایک بار ادا ہو یا ماہوار۔

شیخ ابوزہرہ عرب ملکوں میں نکاح و طلاق اور ان سے متعلق رائج شدہ قوانین کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ان میں تین رجحانات ہیں، جن کی تائید نہ تو فقہی نصوص سے ہوتی ہے اور نہ فقہی مذاہب کے اصول سے۔ ایک تعدد ازواج۔ تونسی قانون میں یہ مطلقاً ممنوع ہے۔ مراکش میں بیویوں میں عدمِ عدل کے اندیشہ کی بناپر اس پر پابندی ہے اور بعض جگہ مالی استطاعت نہ رکھنے کی بناپر اسے ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ دوسرا۔ طلاق۔ تونسی قانون میں طلاق صرف عدالت میں دی جاسکتی ہے۔ تیسرا۔ مرد اور عورت میں عمروں کا تفاوت۔

شیخ موصوف اس کے بعد لکھتے ہیں:" ہم اوّل الذکر دو موضوں پر بحث کرتے ہیں۔ ایک تعدد ازواج، جو تونسی قانون میں صاف صاف ممنوع ہے اور شامی و مراکشی قانون میں خفیہ طور پر۔ اور دوسرا طلاق، جس پر صرف تونسی قانون میں پابندی عائد ہے۔ اور ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ان دونوں امور میں پاکستان تونس کے مسلک پر ہے۔ (وقد علمنا أن باكستان نهجت منهج تونس فى الامرين)"

شیخ ابوزہرہ کی یہ اطلاع کس قدر خلاف واقعہ ہے، اس کا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے۔

اسی سلسلے میں موصوف نے خواتین کی کانفرنسوں میں جو مطالبات کئے جاتے ہیں، ان کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا، اس سے ایک تو یہ واضح ہوا کہ اسلامی حکومتیں اپنے ہاں کے معاشرتی حالات کو سامنے رکھتے ہوئے خاندانی قوانین (فیملی لاز) کی نئی تدوین کر رہی ہیں۔ دوسرے اس تدوین میں پہلے کی طرح صرف ایک مخصوص فقہی مذہب پر انحصار کرنے کے بجائے دوسرے مذاہب فقہ سے بھی مدد لی جارہی ہے۔ اور اس طرح فرقہ وارانہ فقہی تعصب کی دیواریں جو صدیوں سے قائم تھیں، ٹوٹ رہی ہیں۔ تیسرے بعض اسلامی ملکوں میں ایسے خاندانی قوانین بھی بنائے گئے ہیں، جن کی سندِ صریح مذاہب فقہ میں نہیں ملتی۔ اس سلسلے میں پاکستان میں جو کچھ ہوا، اور اس پر علماء کرام کی بعض جماعتوں کی طرف سے جو اعتراضات ہو رہے ہیں، خاص ان کے بارے میں کچھ عرض کرنے کے بجائے مصر یا متحدہ عرب جمہوریہ نے خاندانی قوانین کی تدوین جدید اور ان کے نفاذ میں جو راہ اختیار کی، یہاں ہم شیخ ابو زہرہ کے مضمون سے اس کا مختصر خلاصہ پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔

اس صدی کے اوائل میں بلادِ شرق عربی اور بلادِ ترکیا میں اصلاحی رَو اٹھی۔ ۱۹۱۴ء میں مصر میں ایک کمیٹی

(لجنۃ) بنائی گئی جس کے ذمہ یہ کام کیا گیا کہ وہ نکاح، طلاق اور اولاد کے بارے میں احکام مرتب کرے۔ اور اس میں صرف مذہب ابی حنیفہ النعمان تک محدود نہ رہے، بلکہ وہ مذاہب اربعہ پر بھی نظر ڈالے اور ان سے جو احکام روح عصر سے مناسب اور اس کی مشکلات کو حل کرنے والے پائے، انہیں اختیار کرے۔ یہ کمیٹی مشتمل تھی مذاہب اربعہ کے اکابر فقہاء اور قضاء کا بعض عملی تجربہ رکھنے والوں پر۔ اس کمیٹی نے اپنا کام ۱۹۱۵ء میں مکمل کر لیا۔

کمیٹی کی رپورٹ جب فقہ و قضاء سے تعلق رکھنے والی رائے عامہ کے سامنے پیش کی گئی تو اس کے خلاف ایک طوفان اُٹھ آیا۔ شیخ موصوف کے الفاظ میں "اگرچہ یہ قانونی تجویزیں تمام کی تمام مذاہب اربعہ سے ماخوذ تھیں اور ان کے دائرہ سے انھوں نے تجاوز نہیں کیا تھا، لیکن جو لوگ ان کے خلاف تھے، ان کا کہنا تھا کہ ان میں تلفیق و اختیار (ایک حکم ایک مذہب سے اور دوسرا حکم دوسرے مذہب سے لینا) ہے۔ اور یہ "اجتہاد" ہے۔ اور وہ کمیٹی جس نے یہ تجویزیں مرتب کی ہیں، "اہل الاجتہاد" میں سے نہیں۔

اس مخالفت کے پیش نظر اُس وقت کی مصری حکومت نے یہی مناسب سمجھا کہ اس رپورٹ کو وزارت قانون کی کسی الماری میں ڈال دے، چنانچہ اس طرح یہ تقریباً نسیاً منسیا ہو گئی۔

پہلی جنگ عظیم کے فوراً بعد مصر میں برطانوی قبضے کے خلاف بڑے زور شور سے عوام کی جدوجہد شروع ہوئی، جس میں مصری عورتوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اسی زمانے (۱۹۲۰ء) میں پہلی دفعہ مصر میں خاندانی قوانین میں تبدیلی عمل میں آئی۔ اگرچہ دولتِ عثمانیہ (جس میں شام، لبنان و اردن شامل تھے) اس میں مصر سے سبقت لے گئی تھی۔ یہ تبدیلی تمام کی تمام مذہب مالکی سے ماخوذ تھی۔ اس لئے اس پر "تلفیق" کا الزام نہیں لگ سکتا تھا۔ دوسرے عوامی جدوجہد نے خاندانی قوانین میں اس تجدید احکام کے لئے لوگوں کو تیار کر دیا تھا۔ بہرحال قانون کی یہ تبدیلی بالجملہ عورت کے حق میں تھی۔

اس کے بعد ان قوانین میں وقتاً فوقتاً اور بھی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ اس سے اصلاح پسندوں کے کچھ حوصلے بڑھے چنانچہ ۱۹۲۳ء میں نکاح کے لئے لڑکے اور لڑکی کی عمر کے تعین کا مسوّدہ قانون پیش کیا گیا۔ اس پر پھر ایک قلمی ہنگامہ شروع ہو گیا۔ بات یہ تھی کہ اس کی تائید میں فقہ کے مسلّمہ مذاہب اربعہ میں سے کسی فقیہ کا قول موجود نہ تھا۔ چنانچہ اس کے جواز کے لئے عثمان البتی، عبدالرحمٰن بن شبرمہ، اور ابوبکر اصم کی رائے سے استناد کیا گیا تھا۔ اگرچہ اس بارے میں دولتِ عثمانیہ کا نافذ کردہ قانون پہلے سے موجود تھا۔

شیخ ابوزہرہ کے الفاظ میں "اس قانون کا سفینہ آخر کار اس بحر عمیق میں ڈال ہی دیا گیا، یہاں تک کہ وہ

ساحل امن وسلامتی پر پہنچ گیا۔ اور لوگ ایک طویل زمانے تک اس سے متنفر ہونے کے بعد مانوس ہو گئے۔"

اسی زمانے میں شیخ محمد عبدہ کے بعض شاگردوں نے خاندانی قوانین کے بارے میں بعض بڑی جرأت مندانہ تجویزیں پیش کریں۔ ایسا کرنے کی ہمت انہیں اس لئے ہوئی کہ اس وقت مصری سیاست کے سربراہ امام عبدہ کے تلمیذ اکبر اور آزادی نسواں کے مشہور علَم بردار قاسم امین کے یارِ غار سعد زغلول تھے۔ یہ تجویزیں ایک کمیٹی نے جو ۶؍اکتوبر ۱۹۲۶ء کو مقرر ہوئی تھی، مرتب کیں۔ اور وہ یہ تھیں:۔ (۱) قاضی کی اجازت کے بغیر ایک بیوی کے ہوتے دوسری بیوی سے نکاح کی ممانعت (۲) نکاح کے وقت بیوی نے خاوند سے جو شرطیں منوائی ہوں، ان کی پابندی لازمی قرار دی جائے۔ (۳) مکرہ اور سکران کی طلاق واقع نہ ہوگی۔ (۴) بیوی قولی وفعلی اذیت کی بنا پر خاوند سے طلاق کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ (۵) خاوند بغیر معقول عذر کے ایک سال یا اس سے زیادہ مدت کے لئے غائب ہو جائے اور اس سے بیوی کو تکلیف پہنچے تو وہ فسخ نکاح کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ خواہ خاوند گزارے کے لئے مال چھوڑ گیا ہو۔

اسی طرح کی بعض اور بھی تجویزیں تھیں، جو ایک مسوّدۂ قوانین کی شکل میں مصری پارلیمنٹ کے سامنے پیش کی گئیں تاکہ منظوری کے بعد انہیں قانونی حیثیت دی جائے۔ ازہر کے علماء کبار نے تو ان پر سخت اعتراضات کئے، لیکن بعض ایسے علماء بھی تھے، جنہوں نے ان کی تائید کی۔ شیخ موصوف کے الفاظ میں:۔

اس وقت مصری پارلیمنٹ کے سپیکر اور سیاست مصریہ کے سربراہ سعد زغلول تھے، جنہوں نے اس سے پہلے قاسم امین کی تحریک آزادیٔ نسواں کی پوری حمایت کی تھی اور برملا طور پر اس کا اعلان کیا تھا کہ وہ ان کی آراء سے پورا اتفاق رکھتے ہیں، لیکن سعد زغلول جیسے ممتاز قانون دان نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ اس مسوّدہ پر قانونی بحث ہونے دیں۔ چنانچہ وہ اس معرکۂ کارزار کے دوران، جو قدیم وجدید کے درمیان گرم رہا، مکمّل خاموش رہے۔ اگر وہ اس وقت ان تجویزوں کو پیش کرنے والوں کا ساتھ دیتے تو اس معرکہ کا صاف فیصلہ ہو جاتا، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ چنانچہ آخر میں اس بحث کا خاتمہ یوں ہوا کہ نظرثانی کے لئے مسوّدہ وزارت قانون کو واپس بھیج دیا گیا، وہاں وہ وقتی طور پر طاقِ نسیاں میں پڑا رہا۔ اور بعد میں جب اسے نکال کر قانونی شکل دی گئی تو اس میں کافی تبدیلیاں کی جا چکی تھیں۔

۱۹۴۳ء میں پھر تعدد ازدواج اور طلاق پر پابندی لگانے کا مسئلہ اٹھا، اور اس کی تائید میں شیخ الازہر محمد مصطفےٰ المراغی نے فتویٰ بھی دیا، لیکن قبل اس کے کہ یہ ایک مسوّدہ کی شکل میں مصری پارلیمنٹ کے سامنے

پیش ہوتا، اس وقت کے وزیر اعظم نے اسے دبا دیا۔ اپریل ۱۹۴۵ء میں تیسری بار پھر یہ مسئلہ ابھرا لیکن اس دفعہ بھی یہ پارلیمنٹ تک نہ پہنچ سکا۔ اس موقع پر شیخ المراغی نے اپنی پہلی رائے سے رجوع کر لیا اور کہا کہ اس پابندی کے معاشرے پر بُرے اثرات عدم پابندی سے زیادہ ہوں گے۔

۲۳ جولائی ۱۹۵۲ء کو مصر میں فوجی انقلاب ہوا۔ اور ۱۹۶۰ء میں اتحادِ قومی کی مؤتمر میں تعددِ ازدواج اور طلاق پر پابندیاں لگانے کا سوال پیش کیا گیا، جس پر مؤتمر کے شرکاء نے مختلف اجتماعی، قانونی اور خواتین کی کمیٹیوں میں بحث مباحثہ کیا۔ شیخ ابو زہرہ لکھتے ہیں کہ ان مباحثوں میں صدر جمال عبد الناصر کا موقف بڑا قابلِ ذکر رہا۔ انھوں نے ان میں شرکت کی اور اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ اجتماعی و دینی مسائل ہیں۔ اور انہیں "توجیہہ و ارشاد" (سمجھانے اور تلقین و نصیحت) پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ اگر ان میں کوئی خرابی ہے تو اس کا علاج قانون سے نہیں ہوگا بلکہ اندیشہ یہ ہے کہ ان مسائل کو قانون کے ذریعہ حل کرنے سے اور مفاسد پیدا ہوں گے۔

مروجہ خاندانی قوانین (فیملی لاز) کے بارے میں ہمارے ہاں جو بحثیں چھڑی ہوئی ہیں، آخر میں ہم ان کے ضمن میں عرض کریں گے کہ جہاں تک ان قوانین کو نافذ کرنے کا تعلق ہے، جیسا کہ اوپر تفصیل سے بتایا گیا ہے، حکومتِ پاکستان کا یہ قدم بہت سے اسلامی ملکوں سے کافی بعد اٹھایا گیا ہے۔ نیز اس قدم کی نوعیت میں کئی ایک اسلامی ملک پاکستان سے کہیں آگے ہیں۔ باقی رہا ان قوانین کا خلافِ اسلام ہونا، تو اوپر جو کچھ بیان ہوا، اس سے اس الزام کی حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ البتہ اب سوال رہ جاتا ہے علماء کرام کے بعض حلقوں سے ان کی شدید مخالفت کا۔ تو کیا ان حالات میں یہ مناسب نہیں رہے گا کہ ہم اس بارے میں وہ طریقہ اپنائیں، جو مصر نے عائلی قوانین کے نفاذ کے لئے اختیار کیا۔

ان سطور میں شیخ ابو زہرہ کے جس مضمون کے اقتباسات دیئے گئے ہیں، وہ مجمع البحوث الاسلامیہ قاہرہ کی دوسری مؤتمر منعقدہ مئی ۱۹۶۵ء کی شائع شدہ رپورٹ میں شامل ہے۔ اس مؤتمر کے قاہرہ میں متعدد اجلاس ہوئے تھے، جن میں اکثر مسلمان ملکوں کے ممتاز علماء دین شریک ہوتے رہے۔ پاکستان سے بھی ہمارے بعض علماء نے ان اجلاسوں میں شرکت کی تھی۔ اس مؤتمر کی کارروائی کتابی شکل میں شائع ہوئی ہے۔